عرفان احمد ملک (عرفان عالم)
استاد شعبہ اردو، سنٹرل یونیورسٹی کشمیر، گاندربل کشمیر، انڈیا

ادب میں طلسماتی حقیقت نگاری اور اقبال کی شاعری
(”جاوید نامہ“ کے خصوصی حوالے سے)

Irfan Ahmed Malik (Irfan Alam)
Associate Professor, Department of Urdu, Central University Kashmir, Ganderbal, Kashmir, India.

Magic Realism in Literature and Iqbal's Poetry (Special context with "Javed Nama")

The first creation of literature is most probably criticism. It was criticism which established its very pioneer theory that what real literature is. On this question there are different point of views one can find between Plato and Aristotle. Plato focused on ethical grounds and objectives of literature and on other hand Aristotle wanted pleasure from it. Same thoughts are common in every era of history and it is actually the reality of literature. Realism as a movement firstly started in France in 19th century. The French scholars discussed about complex characters and real issues of the society. In this research article magic realism in Iqbal's Persian Poetry has been discussed.

Key words: *Creation, Literature, Criticism, Established, Plato, Aristotle, Ethical, Complex, Persian.*

شاید ادب کی پہلی تخلیق تنقید ہے اور شاید تنقید نے پہلا یہ نظریہ قائم کیا کہ فن کی حقیقت کیا ہے۔ افلاطون اور ارسطوں کے نظریوں سے جو فطری اختلاف نظر آتا ہے، وہ یہی ہے کہ فن کی نوعیت کیا ہے۔افلاطون فن میں اخلاقی قدروں اور مقصدیت کا خواہاں ہے۔اس کے برعکس ارسطو فن سے مسرت چاہتے ہیں۔ادب کے تعلق سے ایسے نظریات ہر عہد میں نظر آئیں گے اور یہی ادب کی حقیقت ہے۔میں یہاں پر ادبی حقیقت پسندی کو سمجھنا اہتا ہوں۔ادب میں حقیقت پسندی ایک ایسی ادبی تحریک کی شکل میں سامنے آ چکی ہے، جس نے بین الاقوامی سطح پر ادب کو کئی ایک سطحوں پر متاثر کیا۔دراصل یہ زندگی کے تجربات کو پیش کرتے ہوئے حقیقت کی نمائندگی کرتی ہے۔ادبی حقیقت پسندی حقیقت پسندانہ فنی تحریک کا ایک حصہ ہے ،جو انیسویں صدی میں فرانس میں شروع ہوئی اور بیسویں صدی کے اوائل

تک جاری رہی۔فرانس میں حقیقت پسند مصنفین نے جن میں خصوصیت کے ساتھ بالزاک کا نام لیا جاسکتا ہے نے معاشرے کے پیچیدہ کرداروں اور حقیقی مشاہدات کو اپنی تحریر وں میں جگہ دی۔اس کا آغاز اٹھارہویں صدی کی رومانوی ادب کے عروج کے رد عمل کے طور پر سامنے آیا۔رومانوی ادب کے بارے میں حقیقت پسندوں کا یہ دعویٰ ہے کہ ایسا ادب انسان کا رشتہ حقیقی دنیا سے منقطع کر دیتا ہے۔حالانکہ اگر بغائر ادب کا مطالعہ کیا جائے تو لطیف ادب بھی زندگی کی ایک حقیقت ہے، اِس صورت میں اسے غیر حقیقی نہیں سمجھا جاسکتا۔لیکن یہاں حقیقت کے معنی بنیادی طور پر معاشرے کے درمیانی ،نچلے ،کچلے ہوئے طبقے کے ساتھ ساتھ ''اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا'' کو سامنے لانے کی کوشش میں ہیں۔

ادبی حقیقت پسندی کسی ادب پارے کو زیادہ بناوٹی بنانے کے بجائے زیادہ سے زیادہ سچائی سے کہنے پر زور دیتی ہے۔حقیقت پسندی نام سے ظاہر ہے کہ یہ حقیقت کو پیش کرنے کا ایک فلسفہ ہے اور اس فلسفے کے پس پشت یہ بات پوشیدہ ہے کہ عام زندگی کس قدر معنی خیز ہے۔حالانکہ ذہنی بیمار کی عام سطح پر یہ شناخت ہوتی ہے کہ کتنا بھی یہ اچھا ہو ، لیکن ''سنگ اُٹھایا تھا کہ سر یاد آیا'' کے مصداق اِسے ڈر ہی لگا رہتا ہے۔کئی سطحوں پر رومانوی ادب میں اسے مجنون کا نام دیا گیا ہے۔لیکن حقیقی ادب ذہنی بیمار کے بارے میں اس کے برعکس سوچتا ہے۔جیسے منٹو ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' میں پاگلوں کے حوالے سے بات کرتے نظر آ رہے۔نئی تکنیکوں نے ادب میں ایک نئی روح پھونک دی ہیں۔آجکل لکھے گئے بہت سارے ادب پارے عصری امور کے تعلق سے مبہم طریقہ کار اپنانے کے بجائے سیدھی سادی زبان میں اس طریقے سے بات کر رہے ہیں کہ قاری بیانیہ کے تجسس میں کھو جاتا ہے۔نمرہ احمد کا ناول ''مصحف'' اس کی بہترین مثال ہے۔جس میں یہ بات سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے کہ قرآن کس طرح عام زندگی میں انسان کی رہنمائی کرتا رہتاہے۔حقیقت پسندانہ ادب دراصل زندگی کی کتاب ہے اور اس کا مطالعہ جہاں دوسرے لوگوں کے بارے میں آپ کو واقف کار کرتی ہیں، وہی آپ دوسروں کی زندگی سے اپنے بارے میں بھی رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔

گردوپیش کی جب بات کی جائے، تو آج کے دور میں ہم ادب کو مافوق الفطری قصوں وغیرہ سے زیردام نہیں لا سکتے۔اس عہد میں تعمیری ادب کی مانگ بڑھ رہی ہے۔جو زندگی کے بلکل قریب ہو۔ان معنوں میں موجودہ تخلیق وہم وگمان کو حقیقت میں پیش کرنے کے بجائے حقیقت کوتراش و خراش کر کے بناوٹی انداز میں پیش کرنے کا زیادہ تقاضا کر رہی ہے۔تخلیق یا تخیل ہی ادب کی معراج ہے۔یہی امتحان کی جگہ ہے ،جہاں دل و ذہن کا امتحان مقصود ہے۔سوچنے اور ہٹ کے سوچنے میں کافی فرق ہے۔سوچتا تو ہر کوئی ہے ،لیکن اسی سوچ کے دوران ہٹ کے سوچنا ہی تخیل کی اور قدم ہے، جو تخلیق کے لئے راستہ ہموار کرتی ہے۔ہر کوئی اس بات سے واقف تھا اور ہے کہ سیب جب درخت سے گرتا ہے تو نیچے زمین کی اور ہی گرتا ہے۔لیکن نیوٹن اس طریقہ کار کی اور فکر مند ہو گیا ؟اس کی اس فکر مندی

نے ہمیں کشش ثقل کے قانون سے واقف کرایا۔اسی مانند تخلیق کار بھی الگ سوچنے کی بنا پر ہی ہمیں وہ کچھ دیتا ہے جس کے بارے میں دوسرے لوگ جانتے تو ہیں مگر اس کے بارے میں فکر مند نہیں ہوتے۔تخلیق کار اس بابت فکر مند ہو جاتا ہے اور آخر کار یہ کششِ فکر ایک نئی تخلیق کے لئے راستہ ہموار کرتی ہے۔

شاعر اور سائنس داں میں کیا فرق ہے؟دونوں تخلیق کار ہیں۔دونوں کے کام کی بنیاد تجربوں پر ہوتی ہے۔فرق صرف اتنا ہے کہ شاعر کی تخلیق حدود و ابعاد سے عاری ہے اور سائنس داں کی تخلیق کا ایک واضع پیراہن۔لیکن یہاں یہ بات بتانی مقصود ہے کہ ہر ٹھوس تجربہ ایک وقت گزرنے پر گراں گزرتا ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تحدیث کی صورت ہی زندہ رہتا ہے۔ہماری زندگی کو ٹیکنالوجی کی تحدیث نے اتنا خوشگوار بنایا ہے اور یہ تحدیث اگر اس حوالے سے تھم سی جائے گی تو زندگی میں وہ رونق نظر نہیں آئے گی۔اس کے برعکس غالب یا اقبال کی تخلیق میں کسی بھی تحدیث کی گنجائش ہی نہیں۔ اگر اس میں ذرہ برابر بھی تحدیث ہوئی تو شوخی تحریر میں وہ پیکرِ تصویر نظر نہیں آئے گا، جو ہر عہد میں نئے معنوں اور نئے رنگوں میں قارئین کے دِلوں میں اُتر کر روح کی تلقائی تحدیث کرتی آ رہی ہے۔اسی طرح اگر ہم دیگر فنون لطیفہ پر نظر ڈالیں تو وہاں بھی تحدیث کی کوئی گنجائیش ہی نظر نہیں آتی۔

اہرام مصر ہو یا تختِ جمشید یا پھر تاج محل ادب کی طرح یہ آج بھی تازہ دم دیکھائی دیتے ہیں۔ یہ عمارتیں معماری کے فن کے عروج کو بیان کررہے ہیں۔آج ہم جدید ٹیکنالوجی کی مدد سے ان جیسی یا ان سے بھی بہتر عظیم عمارتیں تعمیر کر سکتے ہیں۔اس کی بڑی وجہ یہ کہ آج فن تعمیر اپنے عروج پر ہے ۔ٹیکنالوجی کی بہترین سہولیات ہمارے پاس موجود ہیں۔لیکن ان جدید عمارتوں میں وہ روح نہیں پھونکی جا سکتی جو تاج محل یا اہرام مصر کے مقبروں میں ہے۔اس کے برعکس ادب اس فن تعمیر کو جب اپنے پیرائے میں پیش کرنی کی کوشش کرتا ہے ،تو اسے مزید تقویت ملتی ہے۔ہمارے سامنے مسجد قرطبہ فنِ تعمیر کی ایک عظیم مثال ہے۔لیکن اس کی اصل روح کو مشرق کے دیاروں تک پہنچانے کا صحیح سہرہ اقبال کے سر جاتا ہے۔اُردو زبان و ادب کی تاریخ پر اگر ہم نظر ڈالیں شائد ہی اقبال سے پہلے کسی جگہ ہمیں تاریخی واقعات کے حوالے سے مفصل گفتگو ملتی ہے، اگر چہ حالیؔ کی نظموں میں ہسپانیہ ، قرطبہ وغیرہ کا ذکر ملتا ہے اور کئی لوگوں نے تاج محل وغیرہ کے حوالے سے بھی بات چھیڑی ہے، لیکن تفصیل کے ساتھ کسی تاریخی شاہکار کا ذکر تقریباً پہلی بار اقبالؔ کی نظم" مسجد قرطبہ" کی شکل میں دستیاب ہے۔ نظم "مسجد قرطبہ" مسجد قرطبہ کی طرح ہی فن اور تخلیق کا ایک لازوّال نمونہ ہے۔جہاں یہ نظم فن کاروں کی فن کاری اور مصوری کو اس طرح پیش کرتی ہے، کہ قلب میں گرمی پیدا ہوتی ہے اور روح تڑپ اُٹھتا

ہے ، وہیں اسلامی تاریخ کا وہ سُنہرا باب وا ہوجاتا ہے،کہ کس طرح مسلمانوں نے پورے یورپ میں ایک انقلاب برپا کیا۔

اردو ادب میں حقیقت پسندی کو حقیقی معنوں میں عملی سطح پر عملانے کا سہرہ اگرچہ ترقی پسند تحریک کے سر جاتا ہے۔لیکن اردو ادب کے تعلق سے علی گڈھ تحریک اس سلسلے میں پہلا نام ہے۔سر سید اور ان کے دوستوں نے اردو ادب کو وقت کے نئے تقاضوں کے آینے میں ڈھالنے کی ایک اہم کوشش کی۔حالانکہ شاعری اردو کی آبرو سمجھی جاتی ہیں، لیکن اس تحریک کی مرکزی توجہ اردو نثر ہی رہی ۔نثر میں تکلفات کے بجائے سیدھے سادے انداز بیان کے ساتھ ساتھ مقصدی اور افادی پہلو پرزیادہ زور دیا جانے لگا۔چونکہ اس میں اصلاحی پہلو واضح نظر آ رہا ہے۔یوں یہ تحریک اردو ادب میں سرسید تحریک سے ہوتے ہوئے اصلاحی تحریک کے نام پر ٹھہر گئی۔جلد ہی اس تحریک سے ایک طبقے کی بیزاری بھی نمایاں ہونے لگی۔اس کے بعد اردو ادب کوسب سے زیادہ جس حقیقت پسند تحریک نے متاثر کیا وہ ترقی پسند ادبی تحریک ہے۔یہ تحریک ادب میںتغیر اور جدت پیدا کرنے کے مقصد سے تو شروع ہوئی تھی، لیکن آگے چل کراس میں سیاسی مقاصد شامل ہوتے گئے۔اس طرح یہ ایک مخصوص نظریے پر مبنی معاشرے کی تشکیل کرنے کے کام میں مصروف ہو تی چلی گئی۔اس تحریک کا دائرہ کارعالمی سطح پر ہونے والی فکر ی ، تہذیبی ، سیاسی ،معاشی تبدیلیوں اور نئے علوم و فکر سے اردو ادب کو شناسا کرنے کے ساتھ ساتھ سماج میں ترقی پسندذہن تیار کرنا بھی تھا۔ترقی پسند ادیب سماجی نظام کو بدل کر ایک غیر طبقاتی نظام کی تشکیل چاہتے تھے۔یوں سماجی و اشتراکی حقیقت نگاری کے نام پر اردو ادب میں خصوصاً نئے اسلوب اور نئے اصناف کی بنیاد پڑی۔

اقبال نے دونوں تحریکوں کو بہت ہی قریب سے دیکھااور دونوں تحریکوں میں دلچسپی بھی رکھتے تھے۔لیکن خود عملی طور پر کسی بھی تحریک سے منسلک نہیں ہوئے۔بلکہ اُن کی زندگی اور اُن کی تخلیقات کا اگر بغائر مطالعہ کیا جائے تو ہم پائیں گے کہ یہ کسی بھی صورت میںکسی حقیقت پسند تحریک سے کم نہیں۔اردو شاعری میں پہلی بار اگر کسی شاعر نے اپنی شاعری میں حقیقت نگاری سے کام لیا ہے، بلاشبہ وہ اقبال ہی ہیں۔اقبال نے پہلی بار زندگی کے بنیادی اور حقیقی مسائل کو موضوع بحث بنایا۔اُنہوں نے مزدور،جفاکش ،ہنر مندوں کی دبی کچلی آواز کو زبان دی اور جاگیر دارانہ نظام نیز سماجی نابرابری سے ہو رہے ظلم و استحصال کے خلاف آواز بلند کی۔شاعری کی تکنیک میں اقبال نے اپنے تخیل سے ایسے نئے تجربے آزمائے کہ انسانی زندگی کی ایک ایسی حقیقی تصویر سامنے آنے لگی جس کی دوسری مثال فارسی اور اُردو ادب میں نہیں ملتی۔اقبال کی شاعری اپنے عہد کی ہی نہیں ،بلکہ آنے اور گذرے ہوئے ہر عہدکے سیاسی، معاشی اور سماجی زندگی اور اس زندگی میں ہو رہی اتھل پتھل کو حقیقی انداز سے سامنے لانے کی ایک منظم کوشش ہے۔اردو اور فارسی ادب سے وابستہ قارئین اس بات سے واقف ہیں کہ اقبال کی

تخلیقات میں معانی کا ایک سمندر پوشیدہ ہے۔ وہ مذہب، تاریخ، اساطیر، فلسفہ، اور سائنسی علوم خصوصاً کونیات سے کردار مستعار لے کر انہیں حقیقت پسندی کا جامعہ پہنا نے میں اس طرح کامیاب ہو جاتے ہیں کہ شاعری میں کہانی اور کردار ایک مسلسل مکالمہ کی صورت اس طرح خلق ہو جاتے ہیں کہ اس جادو بیانی میں یہ تصور کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ شاعر ہی اسے بیان کرتا ہے یا پھر شاعری اسے بیان کرتی ہے۔ جیسے شاعری فکشن ہوگئی ہو یا پھر فکشن کلام موزوں۔

ادب میں جادوئی حقیقت نگاری کو سمجھنے سے پہلے ادبی حقیقت پسندی کے دیگر اقسام سے گزرنا لازمی ہیں تاکہ بعدازاں طلسماتی حقیقت کو سمجھنے کے لئے راہ ہموار ہو جائے۔ زندگی کی حقیقت یہ کہ انسان لا شریک نہیں رہ سکتا۔ "بڑے بے آبرو ہو کر" آدم کو خلد سے اکیلے نہیں نکالا گیا تھا، بلکہ اُس کے ساتھ ہوا بھی تھی۔ گویا انسان ازلی شراکت دار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان ایک مخصوص گروہ جو کہ ایک مخصوص اصول و ضوابط اور نظام، مخصوص رسم و رواج کے شرائط پر ایک دوسرے کے ساتھ منسلک زندگی گذارتی ہو۔ ایسا بھی نہیں کہ جانور بھی اسی نوع کے اصولوں پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہاں ایک واضح فرق ہونا ہی چاہئے۔ بلکہ اس اجتماع میں روحانیت شامل حال ہونی چاہئے۔ ورنہ زندگی کی حقیقت یہ ہوجائے گی کہ انسان بچوں کے ڈراموں کی طرح سانپ یا کتا بھی بن سکتا ہے۔ 'معاشرتی حقیقت پسندی"۔ حقیقت پسندی کی ایک قسم جو محنت کش طبقے اور غریبوں کی زندگی اور زندگی بسر کرنے کے حوالے سے بات کرتی ہے۔ اقبال اپنے معاشرے میں معاشی انصاف کی تلاش میں اپنی شاعری کے ذریعے کسان کو جاگیرداری اور مزدور کو سرمایہ داری سے آزاد کرانے کی کوشش میں محو ہے۔ وہ کھیت کے اُس گندم کو آگ لگانے کے قائل ہیں۔ جو کسان کا پیٹ نہیں بھر سکتا۔ یہاں اقبال" اشتراکی حقیقت پسندی" کی تفہیم بیان کر رہے ہیں۔ سماج کی یہ حقیقت پسندی جوزف اسٹالن نے تخلیق کی تھی اور اسے کمیونسٹوں نے اپنایا تھا۔ اشتراکی حقیقت پسندی پرولتاریہ (مزدور طبقہ) کی جدوجہد کو صحیح ٹھہراتا ہے۔ اقبال کی حقیقت پسندی یہ ہے کہ وہ روس کی ہمہ گیر اشتراکی تحریک سے اتنے متاثر ہوئے کہ "ارمغان حجاز" میں یکے بعد دیگرے دو نظمیں اس تحریک کی حمایت میں رقم کی اور جہاں روس کا ذکر کیا وہاں لفظ روس کو بڑے حروف میں نمایاں طور پر دکھانے کی بھی کوشش کی۔

"فطرت پسندی" ایمل زولا کے قائم کردہ چارلس ڈارون کے نظریہ ارتقا کے فطرت پسندی سے متاثر حقیقت پسندی کی ایک شکل ہے ، اس کی رو سے فطری سائنس تمام معاشرتی اور ماحولیاتی مظاہر کی وضاحت کر سکتا ہے۔

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

اقبال کے نزدیک قدرت کے نظام میں ٹھہراؤ، زوال کی شروعات کے اسباب ہیں۔جو رُک گیا ،وہ خود بہ خود زنگ کے رنگ میں ڈھلتا ہوتا ہوا بے رنگ ہو جائے گا اور اُس کی پہچان خود بہ خود زائل ہو جائے گی۔قدرت کے قانون کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنا قدرت سے مناسبت پیدا کرنے کے ہیں۔ یہاں پر میں یہ بتاتا چلو ں کہ اقبال کا تصورِ فطرت مغربی تصورِ فطرت سے یکسر مختلف ہیں۔جس کی تائید سید عبداللہ بھی کرتے ہیں:

> "اقبال کا نیچر لزم مغرب کی فطرت پرستی کے اس مسلک سے جداہے جس میں فطرت کو خدا کا قائم مقام قرار دیا گیا ہے اور علت ومعلول کے قانون فطرت کو ہر حال میں اٹل ثابت کیا گیا ہے حالانکہ خدا کا قانون فطرت کے قانونِ تعلیل (causality) تک محدود نہیں۔۔۔۔" (۱)

چارلس ڈارون کے نظریہ ارتقاء کی بنیاد چار بنیادی اصولوں پر ہے،یہ اصول کچھ اس طرح سے ہیں:

۱۔ تغیرات (variations)،

۲۔ جدوجہدِ بقائ(struggle for existance)،

۳۔ فطری انتخاب(natural selection)،

۴۔ بقائے اصلح (survival of the fittest)

ان سب اصولوں کے نچوڑ کے بعد یہ بات سامنے آ جاتی ہے کہ زندہ رہنے کے لئے جدو جہد لازمی عمل ہے۔فطری انتخاب کے معنی یہ قطعاً نہیں کہ خود بہ خود منتخب ہونے کے ہیں، بلکہ فطرت میں اپنی شناخت پیدا کرنے کے ہیں،تاکہ ماحول سے مطابقت پیدا ہو جائے۔اُسی کی ماحول سے مطابقت پیدا ہو جائے گی جو ماحول میں سب سے بہتر ہواور ماحول کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال سکے۔اس کے لئے چوتھا اصول پہلے تین اصولوں کا نتیجہ ہے۔یعنی جو جاندار تبدیل شدہ ماحول میں فطرت کے ساتھ بہترین مطابقت رکھتا ہو، وہی آگے بڑھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ رزم کی بزم سجانے کے بعد آپ اپنے آپ کو بہترین ثابت کریں،بلکہ اسے ہم تغیرات کے معنوں میں آگے بڑھنے کے عمل سے تعبیر دے سکتے ہیں۔اقبال کا یہ کہنا کہ تغیر سے زمانے میں زندگی ہے،درج بالا اصولوں سے مطابقت رکھتی ہے۔وزیر آغا لکھتے ہیں:

> " اقبال کا تخلیق مسلسل پر زور دینا بظاہر حیاتیات کے نظریہ کے مطابق نظر آتا ہے جس کی رو سے زندگی کے پیکر ایک مسلسل تبدیلی سے ہم کنار ہوکر ارتقا پذیر ہوتے رہتے ہیں۔اقبال جب کہتے ہیں کہ ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

،تو اپنی اس بات کا اطلاق محض وقت کی کارکردگی پر ہی نہیں کرتے،کائنات
کے جملہ اجزا اور عناصر پر بھی کرتے ہیں۔" (۲)

یہی وہ حوصلہ ہے، جو اقبال نئی نسل کو دیتے ہیں، کیونکہ نئی نسل کی حالت یہ ہے کہ اُن کے ہونٹ پیاسے اور ان کے جام ذوق و شوق کی شراب سے خالی ہیں۔چہرے اور دماغ تو روشن، مگر دل میں زنگ لگ چکا ہے۔اسی لئے دل تاریک ہیں۔کم نگاہی، بے یقینی اور نااُمیدی نے ان کی نظروں سے اصلیت غائب کردی ہے۔نئی نسل بجائے خود کے غیر پر اعتماد کررہی ہے۔کلیسا، دیرو حرم کی تفریق میں اس طرح مصروف ہے کہ خود حرم والوں کو یہ پتہ نہیں کہ یہ کیا ہورہا ہے؟ مسلمانوں کے ادارے چاہے وہ اشاعتِ دین سے متعلق ہوں یا عصری معاشی ضروریات کو پورا کرتے ہوں اپنے مقصد سے بیگانہ ہیں۔ ان مدارس ، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبا اصل علم سے بیگانہ ہیں۔نیم ملائوں اور مذہب کے ٹھیکہ داروں اوران جامعات سے فارغ التحصیل خود ساختہ دانشوروں نے ذاتی اور وقتی مفاد کے عوض دین و ملت دونوں کو فروخت کردیا ہے۔غیر اسلامی تصوف سے نوجوان بگڑ گئے ہیں اور اس طرح نئی نسل راہبانہ ذہن اختیار کررہی ہے۔اقبال کو معلوم ہے کہ اس سے نئی نسل اصل اسلام سے دور ہوجائے گی۔اسلام تغیر اور تبدیلی کا سبق دیتا ہے، نہ کہ راہبانہ زندگی کا۔اقبال زندگی کو ہر وقت جواں اور پیہم دواں سمجھتے ہیں۔"بانگ درا" کی ایک نظم "زندگی" میں کیا ہی زندگی کا کُن فیکونی خاکہ کھینچا ہے۔

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی
زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی

اقبال نئی نسل سے مخاطب ہوکر کہتے ہیں کہ جو یہ زندگی آپ کو دی گئی ہے، یہ زندگی صرف مرنے اور جینے کا نام نہیں ہے۔زندگی محض چند سال زندہ رہنے یا نفس شماری کا نام نہیں، بلکہ اس تصور سے بالاتر ایک بڑی حقیقت ہے۔کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو کب کے مٹی میں سوچکے ہیں لیکن اپنے کام کی وجہ سے آج تک زندہ ہیں اور کچھ لوگ جو زندہ ہیں، مگر لگتا ہے کہ انہوں نے جنم بھی لیا تھا۔اقبال زندگی کو کلینڈر کے پیمانوں سے ناپنے سے بیزار ہیں۔یہ دنوں اور راتوں سے بالا تر ہے۔زندگی ایک دائمی حقیقت ہے زمانہ اس کو فنا نہیں کرسکتا ، کیوں کہ یہ ایک پیہم حرکت کا نام ہے۔زندگی اصل میں ایک جوش اور ولولہ کا نام ہے، جس کی بدولت وہ ظہور کیلئے بیتاب رہتی ہے اور اس جہاں میں وہی زندہ ہے جو اللہ کی طرح 'کن' کہہ کر نئی دنیا پیدا کرسکے۔اقبال نے اپنے فلسفۂ حیات میں بنیادی حیثیت 'حرکت' کو ہی دی ہے۔جو حرکت کرے گا وہی طاقتور بن جائے گا اور صرف طاقتور ہی اپنے ماحول کی تخلیق اور حفاظت کرسکتا ہے۔اس کے بجائے کمزور خود کو ماحول کے مطابق ڈھالنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔

ماحول کی تخلیق اورحفاظت انسان کی ذہن سازی پر ہے۔نفسیاتی سطح پر اگر دیکھا جائے تو ہم پائیں گے کہ روز اول سے ہی ایک انسان دوسرے انسان پر مختلف طریقوں سے ظلم کرتا آیا ہے۔انسان کو غلام بنانے کا رواج ایک قدیم تصور ہے۔آج کل جسمانی غلامی کے بجائے ذہنی اور نفسیاتی غلامی عروج پا رہی ہے۔" نفسیاتی حقیقت پسندی "اور "جمالیاتی حقیقت پسندی" ادب میں اسی حوالے سے بات کر رہی ہے۔ادب میںحقیقت پسندی کا یہ تصورمعاشرتی یا سیاسی امور پر اظہار خیال کرنے کے لئے جمالیاتی انداز بیان اختیار کرتے ہوئے نفسیاتی مسائل کو اجاگر کرنے میں ایک اہم کردار ادا کرتا آیا ہے۔اس طرز تصور میں مشن مقدس کے تحت مذہبی راہنماؤں کو مقدس بنانے کا فارمولا ، عقل کے بجائے دل یا جذبات کو ترجیح، اختلافِ رائے سے پرہیزگاری اور مخالفت کی حوصلہ افزائی ، برین واشنگ کے نئے طریقے وغیرہ شامل ہیں۔اقبال اپنی نوائے سحری میں ساحری کی اس نفسایات کی واشگاف الفاظ میں مخالفت کرتے ہوئے اس ذہنی غلامی سے نکلنے کی دعوت دے رہے ہیں۔

جادوئی حقیقت پسندی ادبی حقیقت پسندی کی ایک ایسی قسم جہاں تصور اور حقیقت کا انضمام ہوتاہے۔جادوئی حقیقت پسندی اردو ادب میں ایک نئی اصطلاح اور تکنیک کے بطور شامل ہوئی ہے۔جس میں حقیقی دنیا کو جادو یا خیالی تصور کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔آسان الفاظ میں اسے یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ سچائی کو ساحرانہ انداز میں پیش کرنے کا ہنراور اس میں ایسے جادوئی عناصر شامل کرنا جویا تو حقیقت میں نہیں پائے جاتے یا پھر اُن کا اطلاق ممکن نہیں۔اِس کا مقصد کسی ادب پارے کو دلچسپ بنانے کے ہیں۔اصطلاحی سطح پر ادب میں طلسماتی حقیقت نگاری کا استعمال سب سے پہلے ۱۹۲۵ء میں جرمنی کے فنون لطیفہ کے ناقد" فرانسز روہ"(Franz Roh) نے اپنی کتاب نَچ ایکسپریشنزم: میجیشیریس ریلیزیم (After Expressionism: Magical (Nach Expressionismus: Magischer Realismus Realism"طلسماتی حقیقت نگاری:اظہار خیال کے بعد" میں کیا تھا۔روہ (Roh)نے "طلسماتی حقیقت نگاری"کی اصطلاح کا استعمال کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ اجنبی ، تصوراتی اور عجیب و غریب چیزیں حقیقی دنیا پر کس طرح اثر انداز ہو سکتی ہے۔اس کی مقبولیت جنوبی امریکہ میں اُس وقت بڑھ گئی جب پہلی بار ۱۹۲۷ء میں اُن کی کتاب کا ترجمہ ہسپانوی زبان میں ہوا اور معروف روسی اور فرانسیسی مصنف الیجو کارپینٹر(Alejo Carpentier) روہ(Roh) کے اس فلسفے سے اتنے متاثر کہ انہوں نے روہ(Roh) کے اس نظرئے میں مزید وضاحت کرتے ہوئے ایک اور نئی اصطلاح "حیرت انگیز حقیقت نگاری"کا اضافہ کیا۔

اگر ہم اردو زبان و ادب کی بات کریں تو اس نے ہمیشہ دوسرے زبانوں کے ادب سے اکتسابِ فیض حاصل کیا ہے۔"طلسماتی حقیقت نگاری" کو جہاں آج مغربی ادب سے مستعار اصطلاح سمجھا جاتا ہے۔اگر شعوری سطح پر دیکھا جائے اردو زبان کے ادب کی بنیاد حقیقی معنوں میں طلسماتی ادب پر ہی

قائم ہے۔اردو ادب میں اکثر اصناف، اسالیب اور موضوعات فارسی ادب سے ہی اثر انداز ہوئے ہیں یا لئے گئے ہیں۔کلاسیکی اصناف قصیدہ،مثنوی،مرثیہ،داستان جیسی اصناف کے لئے موضوعات کا انتخاب تصوف،رندی سرمستی،مہم جوئی، فوق الفطری، سحر و طلسم ،معاملہ بندی،حسن و عشق اور انہیں بیان کرنے کے اسالیب زیادہ تر داستانی ،اساطیری ،استعاراتی و تمثیلی ہوا کرتے تھے۔

ادب کی تخلیق کا تعلق اصل میں انسان کی جبلتوں اور وجدان پر ہوتا ہے۔اپنے اپنے قومی مزاج، تہذیب وتمدن،معاشرت و معیشت،عقائد و رسومات کے تحت ہر زبان کا ادب مختلف ہو سکتا ہے۔ لیکن ایک یکسانیت تمام عالمی ادب میں مل سکتی ہیں اور وہ ہیں مذہب کا اثر۔اسی لئے اکثر ادب میں حیات و کائنات کے اسرار و رموز اور اخلاقیات کے بیانیہ کے لئے مذہب کی تبلیغ کا رجحان نظر آتا ہے۔جو آج بھی کسی نہ کسی صورت میں شامل ادب ہے۔اردو میں اس کی تازہ مثال جیسا کہ راقم نے پہلے ہی رقم کیا کہ نمرہ احمد کا ناول ''مصحف'' بھی ہمارے سامنے ہے۔ان معنوں میں اردو کے ابتدائی ادب سے عصری ادب تک مذہب کا اثر صاف دیکھائی دیتا ہے۔اقبال نے بھی اپنی نوائے شوق کے لئے مذہب کو اپنانے کی ٹھانی۔لیکن یہ طریقہ ادب عام ادبی طریقے سے قدرے مختلف تھا۔یہاں اقبال نے بت شکنی کا براہیمی ؑطریقہ اختیار کیا۔جس کی درویشی میں توحید کا رقص دور سے کعبہ کے گردش طواف کرتا نظر آئے گا۔اس درویشیانہ فلسفے نے ایک نئے اسلامی ادب کے مباحث کے لئے در وا کئے۔یوں شاعری میں ایک نئی روحانیت شامل ہوتی گئی۔روحانیت انسان کے جمالیاتی حِس کو جگاتا ہے۔جس دل میں روحانی رقص رقصاں ہو جائے اُسے ہر چیز میں جمال ہی جمال نظر آئے گا۔شاعری جمالیات ہے۔جب یہ دِلوں سے گزرتی ہے تو خودبہ خوددِل میں جمالیاتی قدریں بیدار ہو جاتی ہے اور ظلمات نور میں تبدیل ہو جاتا ہے۔شاعری کا جمال اس کے اجمال میں پوشیدہ ہے۔اجمال کا جمال الفاظ کے برتاؤں میں۔یہاں اجمال کے آینے کا جادو یہ کہ اس میں کائنات سما سکتی ہے۔کیونکہ عاشق کی کائنات کا دائرہ عشق کے اجمال کے اردگرد گھومتا ہے۔یوں عین غزل کی طرح اِسی اجمال سے جمال کا ایک ایسا تصور وا ہو جاتا ہے، جس کی وسعت کا اندازہ لگانا ناممکن بن جاتا ہے۔اسے ہم اصطلاحی معنوں میں بیانیہ کہہ سکتے ہیں۔اجمال کے جمال میں بیانیہ کا ایسا فن موجزن ہو جاتا ہے کہ کائنات کم پڑ جاتی ہیں۔یہاں الفاظ کی تخم ریزی معنوں کے ایسے در کھول دیتی ہے کہ حُسن میں وہ ادا تلاش کرنی مشکل کیا ناممکن ہو جاتی ہے جس کا کوئی نام ہی نہیں!ایسے میں قاری بیانیہ کے چکر میں یوں کھو جاتا ہے کہ نکلنے کا راستہ ہی بھول جاتا ہے۔اصل میں شاعری کی روح اِسی فن میں سمائی ہوتی ہے کہ کم الفاظ میں وسیع بات بیان کی جائے اور شاعری کے حوالے سے بیانیہ کا علم بھی اسی فن کا نام ہے۔یہ طریقہ کار ایک طرح کی مصوری ہے۔

طلسماتی حقیقت نگاری کی خصوصیات یہ ہیں کہ حقیقت نگاری کو کس طرح سے جادوئی انداز میں ترتیب دے کر پیش کیا جائے، تاکہ کہانی میں زیادہ سے زیادہ زور بیان ، جمالیاتی حسن، اثر آفرینی، دلکشی و

رنگینی پیدا کی جائے۔۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی،کم از کم دو ہزار اشعار پر مشتمل اقبال کی شاہکار فارسی مثنوی"جاوید نامہ" اس کی بہترین مثال ہے۔اقبال اسے اپنی زندگی کا حاصل سمجھتے تھے۔طلسماتی حقیقت نگاری میں ایسے جادوئی عناصر کار فرما ہوتے ہیں جو بظاہر زندہ نہیں ہوتے لیکن ڈرامائی انداز میں بات کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔یہ عجیب و غریب عناصرنہ ہوتے ہوئے بھی الہامی انداز میں ادب پارے کے اندر معمول کے مطابق پیش کیے جا سکتے ہیں۔"جاوید نامہ " اقبال کا خیالی سفرنامہ ہے جس میں اقبال اپنے رہبر مولانا روم کے ساتھ ایک خیالی سفر پر نکلتے ہیں اور مختلف سیاروں پر مختلف شخصیات سے ہم کلام ہو جاتے ہیں۔اس مثنوی میں متنوع علمی و فکری، دینی و سیاسی اور اجتماعی حقائق کو پیش کیا گیا ہے۔جادوئی حقیقت پسندی سے وابسطہ تخلیق کار جان بوجھ کر اپنے فن پارے میں ایسے موضوعات بھی لیتے ہیں جن کا کہانی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔لیکن جیسے ان کا تعلق کہانی سے جڑ جاتا ہے اور جلد ہی انہیں غیر واضح طور پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اس بات کو تقویت ملے کہ یہ روزمرہ کی زندگی کا ایک حصہ ہے۔جاوید نامہ میں ہر طانوی فوجی جنرل ہربرٹ کچنر اور فرعون آپس میں باتیں کرتے ہیں فرعون کچنر کو طعنہ دیتے ہوئے کہتا ہیں کہ ہم تو مفت میں بدنام ہیں۔اصل میں یورپ کے لوگ بے رحم ہیں اور بے درد ہیں انہوں نے ہماری قبریں تک کھود ڈالیں۔ کچنر جواب دیتا ہے کہ ہمارا مقصد سائنس اور علم آلاثارِ قدیمہ کی خدمت ہے۔قبریں اس لیے کھودی ہیں کہ معلوم ہو جائے کہ آج سے تین چار ہزار قبل دنیا کی حالت کیا تھی۔ فرعون اس کے جواب میں کہتا ہے۔ٹھیک کہ ہماری قبر تو تم لوگوں نے علم و حکمت کے لیے کھودیں۔ لیکن مشہور سوڈانی مجاہد مہدی سوڈانی کی قبر کو کھودنے کا کیا مقصد تھا۔بتایا جاتا ہے کہ مہدی سوڈانی کو قبر سے نکالنے کے بعد اس کی لاش کی ہڈیاں تک جلا دی گئی تھی۔

اکثر وبیشتر جادو ئی حقیقت نگاری میں تشبیہہ،استعارہ، تمثیل کی مدد سے معاشرے کے تلخ حقائق کی تنقید بھی کی جاتی ہے۔سیاست، سامراج،غربت، اشرافیہ، معاشی سطح پر ہورہے ظلم اور استحصال۔ جادو ئی حقیقت پسند تخلیق کاروں کا اہم موضوع رہا ہے۔ادبی تنقید میں نقاد اپنے زمانے اورحالات کو مد نظر رکھتے ہوئے تجربات اخذ کر کے انہیں الفاظ کا جامعہ پہنا کر ادبی تخلیق پر اثر انداز ہونے کی کوشش کرتاہے۔۱۹۱۷ء میں انقلابِ روس تاریخی لحاظ سے ایک غیر معمولی واقعہ ثابت ہوا۔اس نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔عالمی ادب کا فلسفہ یہ یکا یک تبدیل ہوگیا۔اب مذہب باطل تصور کیا جانے لگا۔ مذہب کی جگہ معیشت نے لے لی۔اردو ادب پر بھی یہ تحریک اثر انداز ہوئی۔ترقی پسند ادب کو مارکسی ادب سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔یہ اردو کی ایک جاندار تحریک سمجھی جاتی ہیں۔یوں ہم اس بات کو اس طرح بھی سمجھ سکتے ہیں کہ مارکسی خیالات اور تصورات کس طرح ادب پر اثر انداز ہوئے۔کہ اقبال مارکس کے حوالے سے یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ "نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب"۔"جاوید نامہ" میں اقبال کارل مارکس کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ ایسے پیغمبر ہیں جن کے پاس جبریل کے ذریعے پیغام

نہیں آتا۔اگرچہ یہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ ؑکی نسل سے تعلق رکھتے ہیں اور سرمایہ دارانہ نظام کی مخالفت کرتے ہیں۔لیکن اس کا پیغام روحانیت سے خالی ہے۔مارکس کا مکالمہ صرف پیٹ کی مساوات پر قائم ہے۔ یہاں علامہ نے اسلامی مساوات اور اشتراکی مساوات کا فرق صاف صاف ظاہر کر دیا ہے کہ اشتراکیت کی اساس پیٹ پر ہے جب کہ اخوت کی بنیاد جذبہ پر ہے۔اشتراکیت کے بیانیہ کے بعدا قبال ملوکیت کی مخالفت کرتے ہیں۔ان کے نزدیک یہ صرف بدن کو موٹا کرتی ہے اور اس کا بے نور سینہ دل سے خالی ہے۔یہ اُس شہد کی مکھی کی مانند جو پھول سے رس چوس لیتی ہے۔ملوکیت میں انسان غلامی کے مرض میں مبتلا ہو جاتا ہے اور ان کی باطنی موت ہو جاتی ہے۔

طلسماتی حقیقت نگاری میں کہانی کا پلاٹ انوکھا ہوتا ہے۔دوسرے ادبی اصناف کی طرح واضح آغاز ، وسط اور اختتام کے ساتھ ایک عمومی داستانی خم پر عمل نہیں کرتی ہے۔اس سے پڑھنے والے کو زیادہ شدت کا تجربہ ہوتا ہے ، کیونکہ قاری کو یہ بات معلوم نہیںہوتی کہ پلاٹ کب آگے بڑھے گا یا کب رک جائے اور کہاں ختم ہو گا۔اس منظوم آسمانی خیالی سفر نامے کو لکھنے سے پہلے شاعر نے اس طرح پر لکھی گئی تمام دستیاب کتابوں کا مطالعہ کیا تھا۔کیوں کہ اس کتاب کا ایک حصہ حقائق معراج کے لیے مخصوص کیا گیا ہے۔جاوید نامہ کے متعلق خود اقبال فرماتے ہیں"یہ حقیقت میں ایشیا کی ڈیوائن کامیڈی ہے۔"کتاب کا آغاز مناجات سے ہوتا ہے۔شاعرشام کے وقت دریا کے کنارے مولانا روم کے بعض اشعار پڑھ رہا تھا کہ مولانا رومی کی روح وہاں حاضر ہوجاتی ہیں شاعر رومی کی روح سے چند سوال کرتا ہے، جس کا جواب رومی کی روح دیتی ہے۔پھر رومی اور شاعر کی روح فضا کا سفر کرتی ہے ،راستے میں وہ ستاروں کا نغمہ سنتے ہیں جو ان کو خوش آمدید کہتے نظر آتے ہیں۔چاند پر رومی اور شاعر ٹھہر جاتے ہیں۔یہاں ان کی ملاقات ایک جہاں دوست قدیم ہندو رشی و شوامتر سے ہوتی ہے۔یہاں سے نکلنے کے بعد وہ چاند کی ایک وادی کی طرف جاتے ہیں جسے فرشتوں نے وادی طواسین کا نام دے رکھا تھا۔" طواسین" منصور حلاج کی کتاب کا نام ہے۔وادی طواسین میں علامہ نے گوتم بدھ، زرطشت، حضرت عیسیٰ ؑاور حضور نبی کریم ؐکی تعلیمات بیان کی ہیں۔فلک قمر سے رومی و علامہ فلک عطارد پر پہنچتے ہیں اور وہاں سیّد جمال الدین افغانی اور سیّد علیم پاشا کی ارواح کی زیارت کرتے ہیں۔پھر وہ فلک مریخ پر ایک نام نہاد پیغمبر عورت کو دیکھتے ہیں جسے بچپن میں شیطان اغوا کرکے لے گیا تھا وہ عورتوں کو ترقی اور آزادی کے نئے اُصول بتاتی ہیں۔پھر وہ ایک فلک پر منصور حلاج، غالب اور قرالعین طاہرہ کی روحوں سے ملتے ہیں۔ پھر اقبال اور رومی ایک اور فلک پر جاتے ہیں جس کو منحوس سمجھا جاتا ہے، جہاں وہ روحیں ملتی ہیں کہ جنہیں دوزخ نے بھی قبول نہیں کیا اور وہاں میر جعفر اور میر صادق کی روحیں ہوتی ہیں۔پھر ایک فلک پر فرعون اور لارڈ کچنر کی روحیں نظر آتی ہیں اور ان کا ایک دلچسپ مکالمہ ہوتا ہے، پھر شاعر اور رومی سیاروں سے گزرتے ہوئے جنت میں داخل ہوتے ہیں وہاں وہ اولیا ؑاور نیک بادشاہوں سے ملتے ہیں جن

میں نادر شاہ، احمد شاہ ابدالی اور ٹیپو سلطان شامل ہیں پھر شاعر اور رومی آگے بڑھ جاتے ہیں اور رومی ایک مقام پر انہیں تنہا چھوڑ دیتا ہے کیوں کہ اللہ کے حضورسب کو تنہا جانا ہوتا ہے وہاں شاعر خدا کے صفت و جمال و تجلی سے بعض سوالات پوچھتا ہے آخری حصے میں شاعر اپنے بیٹے سے خطاب کرتا ہے جو دراصل نئی نسل سے مخاطب ہیں۔یہ سارا قصہ دار صل حقیقت پر مبنی ہے، جسے طلسماتی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ عبداللہ سید ،مقاصد اقبال،لاہور،علمی کتب خانہ:۱۹۸۱ء:ص۲۴۱۔

۲۔ آغا وزیر،دریافت،اسلام آباد،نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو ئجز:۲۰۰۳ء:ص۳۶۳۔

۳۔ Nach Expressionismus: Magischer Realismus (After Expressionism: Magical Realism)

۴۔ جاوید نامہ(طبع خاص)،علامہ اقبال، اقبال اکادمی پاکستان ، لاہور، ۱۹۸۲ء۔

References in Roman Script

1. Abdullah Syed, Maqasid Iqbal, Lahore, Ilmi Kitab Khana, 1981, Page241
2. Agha Wazir, Daryaft, Islamabad, National University of Moden Languages, 2003, Page 363.
3. Nach Expressionismus: Magischer Realismus (After Expressionism: Magical Realism)
4. Javed Nama (Taba Khas), Alama Iqbal, Iqbal Academy Pakistan, Lahore, 1982.